مولانا محمد حنیف ندوی

اسلام کا تصوّرِ ثقافت

(۴)

آخرت پر ایمان

تیسرا اہم پیمانہ جس سے اسلامی تہذیب و ثقافت کا مزاج متعین ہوتا ہے۔ ایمان بالآخرۃ کا عقیدہ ہے۔ مختصر لفظوں میں اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام زندگی کو امتزاجِ عناصر کا کرشمہ قرار نہیں دیتا اور نہ اس بات کو تسلیم کرتا ہے کہ جہاں یہ کارخانہ بگڑا زندگی کا شیرازہ بکھرا۔ انسانی اُنا ختم ہوئی۔ اور اس کی وہ تمام تہذیبی و تخلیقی کوششیں رائیگاں گئیں جن کے بل پہ اس کائنات کی گہما گہمی اور رونق قائم ہے۔

اس زاویۂ نگاہ کے برعکس اسلام اس رائے کا حامی ہے کہ زندگی کائنات کی اصل ہے۔ زندگی اس عالم کی روح ہے اور امتزاجِ عناصر کا قصّہ اسی روح اور اسی اصل کا نتیجہ ہے۔ برگساں کی ہمنوائی میں اقبال نے بہت ٹھیک کہا ہے کہ یہ سعی نغمہ کی کارفرمائی ہے کہ اس سے منقار وجود میں آئی[1] ورنہ منقار تخلیق نغمہ کا سبب نہیں ہو سکتی۔ اسی حقیقت کو منطق کی خشک زبان میں یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ جسمِ انسانی کی ترکیب و ساخت میں رشتہ و تعلق کی نوعیت یہ ہے کہ زندگی کی طرفہ طرازیاں علت ہیں اور جسم معلول ــــ اسلام کا فلسفۂ حیات یہ ہے کہ انسانی تخلیق کا مقصد ابھی پورا نہیں ہوا۔ اسے عبودیت کی راہوں میں آگے بڑھنا ہے اور موت کے علی الرغم ترقی کرنا، اور صفاتِ الٰہی کی روشنی میں اپنے سفر و سلوک کو جاری رکھنا ہے تاکہ نقص، گناہ اور تضادات کے اس چکر سے رہائی پا کر زندگی کا چہرۂ زیبا اور نکھر سکے اور سنور سکے۔ اور جمال و کمال کی ان نعمتوں سے بہرہ مند ہو سکے:

---

[1] اقبال کے اس شعر کی طرف اشارہ ہے: کبک پا از شوخیِ رفتار یافت ۔ بلبل از سعیِ نوا منقار یافت

جو اس کا حقیقی مقدر اور نصب العین ہیں۔ یعنی اس فانی اور زمانی انسان کو ابھی ابدیت کے مزے لوٹنا ہے۔ یہی وجہ ہے، قرآن حکیم نے توحید کے بعد جس عقیدہ کی بار بار تلقین کی وہ ایمان بالآخرۃ کا عقیدہ ہے۔

فقال یاقوم اعبدوا اللہ وارجوا الیوم الاخر۔ ولا تعثوا فی الارض مفسدین ٥ (عنکبوت: ۳۶)

(شیث نے کہا۔ اے میری قوم! اللہ کی بندگی کرو اور آنے والے دن پر یقین رکھو اور زمین میں فساد نہ پھیلاتے پھرو۔

من اٰمن باللہ والیوم الاخر وعمل صالحًا۔ فلاخوف علیھم ولاھم یحزنون ٥ (مائدہ: ۶۹)

ان میں جو کوئی اللہ پہ ایمان لائے اور آخرت کو مانے اور اچھے کام کرے تو ان کو نہ خوف کا سامنا ہے اور نہ حزن کا۔

قل متاع الدنیا قلیل والاخرۃ خیر والبقیٰ۔ (نساء: ۷۷)

کہہ دیجیے دنیا سے بہرہ مندی کم ہے اور آخرت اس شخص کے حق میں کہیں بہتر ہے جو اللہ سے ڈرتا ہے۔

منکم من یرید الدنیا ومنکم من یرید الاخرۃ (آل عمران: ۱۵۲)

اور تم میں کوئی دنیا کا طالب تھا اور کوئی آخرت کا۔

بحث کے اس موڑ پر ہم اس نوع کی مابعد الطبیعی بحثیں چھیڑنا نہیں چاہتے کہ حیات بعد الممات کا تصوّر مختلف قوموں میں کیونکر ابھرا۔ اور عہد طفلی ہی میں انسان اس حقیقت کو پالینے میں کیسے کامیاب ہوگیا کہ زندگی کا سفر ہنوز طے نہیں ہوا، حالانکہ اس دور کا عاقل و بالغ انسان علم و عرفان کی اس نعمت سے محروم ہے۔ اس بحث کا یہ محل نہیں۔ ہم اس مرحلہ میں صرف یہ کہیں گے کہ خود زندگی کی اپنی فطرت دوام تسلسل اور ارتقا چاہتی ہے۔ موت ارتقا کا محض ایک مرحلہ ہے۔ جس کا تعلق زندگی کے مادّی پہلو سے ہے اور زندگی کا جو پہلو اللہ تعالیٰ کے فیوض ابدیت سے وابستہ ہے اس کو نہ فنا سے واسطہ ہے اور نہ موت سے کوئی خدشہ۔

موضوع کی موزونیت کے پیش نظر ہمیں یہاں محض یہ بتانا ہے کہ ایمان بالآخرۃ کا عقیدہ ہمارے تہذیبی رجحانات کو کیونکر متاثر کرتا ہے اور کس طرح ان کے لیے نئے سانچے اور نئی نئی سمتیں فراہم کرتا ہے۔ ایمان بالآخرۃ کے تصوّر سے زندگی کے چلن میں تین واضح تبدیلیاں ابھرتی ہیں۔ یوں بھی کہہ سکتے ہیں

کہ ایمان بالآخرۃ کی وجہ سے روزمرّہ کی اجتماعی تگ ودَو میں تین نمایاں عناصر کا اضافہ ہوتا ہے :

۱- تقدیسِ حیات

۲- اختصار و توازن

۳- پاکیزگی اور محاسبہ کا احساس

تقدیسِ حیات سے ہماری مراد یہ ہے کہ وہ زندگی جو ہر آن مصائب اور تضادات سے دوچار رہنے کی وجہ سے تیرہ و تار نظر آتی ہے، اس خیال سے دمک اٹھتی ہے کہ یہ زندگی کی حقیقی جھلک نہیں۔ ان تاریکیوں کو بہرحال چھٹنا ہے اور ایک نئی صبح ازل اور نئے آفتابِ ابدیت کو سج دھج کے ساتھ افقِ نقش پر طلوع ہونا ہے۔ اس عقیدہ سے قنوط و مایوسی کا یہ رخ دُور ہو جاتا ہے کہ میری موت سے میری اُنا، میری کوششیں اور میرا تشخص بھی مٹ جائے گا۔ اس کے برعکس ایمان بالآخرۃ کا عقیدہ دل میں یقین و اذعان کے اس نقش کو بٹھاتا اور اُجاگر کرتا ہے کہ میری موت سے ترتیبِ اشیا میں اس سے زیادہ تبدیلی رونما نہیں ہوئی کہ میں نے کوٹ اتار کر شیروانی پہن لی ہے یا کچن سے ڈرائنگ روم میں منتقل ہو گیا ہوں جس کا مطلب یہ ہے کہ موت کی حیثیت اس سے زیادہ نہیں کہ یہ تبدیلیِ ماحول کا دوسرا نام ہے اور اگر اس کی ہیبت و خوف کو ہم ایمان کے اس درجہ پہ لے آئیں۔ اور فنا کے بجائے اسے بقا کی طرف بڑھتا ہوا ایک قدم قرار دیں تو نہ صرف یہ حقیقتِ حال کا اعتراف ہوگا بلکہ اس سے خود زندگی زیادہ استوار زیادہ بامعنی اور زیادہ مقدس ہو جائے گی اور یہی زندگی کا اصل مصرف ہے۔

وان الدار الاخرۃ لھی الحیوان لو کانوا یعلمون ۝ (عنکبوت: ۶۴)

بلاشبہ آخرت کی زندگی ہی اصل زندگی ہے۔ کیا اچھا ہوتا اگر یہ اس حقیقت کو جان لیتے۔

ایمان بالآخرۃ کا عقیدہ زندگی کے بے پناہ پھیلاؤ میں کس طرح خوشگوار اختصار و توازن پیدا کرتا ہے اور مادیت کے اس بڑھتے ہوئے ریلے میں دنیا کس عظیم خطرے سے دوچار ہے، اس کو سمجھنے کے لیے یورپ اور امریکہ کے اس لٹریچر کو پڑھنا چاہیے جس کو وہاں کے مستقبل آشنا[1] (Futurist

---

[1] یہ عمرانیات کے ماہرین کا وہ گروہ ہے، جو ان حقائق کا جائزہ لینے میں مصروف ہے کہ ہماری سائنسی ترقیات کن خطرات کی حامل ہیں۔ اور یہ کہاں خطرات کی روک تھام کے لیے ہمیں کیا کرنا چاہیے۔

اہلِ دانش نے ترتیب دیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اگر سائنس اور ٹیکنالوجی کے ترقی پذیر تقاضوں کے لیے کوئی نصب العین نہ وضع کیا گیا یا ارتقا برائے ارتقا کے اصول پر پابندیاں نہ عائد کی گئیں اور اس چیز کے مواقع برابر فراہم کیے جاتے رہے کہ لذتِ ایجاد کا سلسلہ وسیع سے وسیع تر ہوتا جائے تو اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ خود تہذیب انسانی کے لیے عظیم خطرات پیدا ہو جائیں گے۔ مثلاً دھوئیں اور گیس سے ساری فضا زہرآلود ہو جائے گی۔ انسانی اختیار اور نشاط آفرینی کا دائرہ نت نئی ایجادات سے تنگ سے تنگ تر ہوتا جائے گا۔ یہی نہیں، بقول حکیم الامت علامہ اقبال کے زندگی احساس مروت اس لطیف جذبہ سے قطعی عاری ہو جائے گی جس سے انسانی رشتوں کا وجود قائم ہے۔ سب سے بڑھ کر خطرہ یہ ہے کہ آخر آخر میں یہ انسان مشینوں کی دائمی رفاقت سے خود مشین بن کر رہ جائے گا اور اپنا وہ روحانی، اخلاقی تشخص کھو بیٹھے گا جس کی وجہ سے یہ مسجودِ ملائک قرار پایا تھا۔

یہ مستقبل آشنا حضرات دراصل ایک طرح کے تضاد (Dillemma) سے دوچار ہیں جو یہ ہے کہ اگر یہ سائنس اور ٹیکنالوجی کے سیلاب بے پناہ کے آگے کوئی رکاوٹ کھڑی کرتے ہیں تو اس سے تہذیب کے ارتقائی پہلو مجروح ہوتے ہیں اور تہذیب منجمد اور غیر متحرک ہو کر رہ جاتی ہے۔ اور اگر تہذیب کی تیز رفتاریوں کا ساتھ دیتے ہیں تو خود زندگی کے لیے گوناگوں اور نئے نئے خطرات پیدا ہو جاتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اس تضاد سے بچ نکلنے کا طریق کیا ہے؟ ان کی تجویز یہ ہے کہ فضا کو دھوئیں، گیس اور ایٹمی اثرات سے بچانے کے لیے ضروری ہے کہ خود سائنس اور ٹیکنالوجی سے استصواب کیا جائے اور ایسی تدابیر اختیار کی جائیں۔ جن سے یہ مضرتیں ممکن حد تک دور ہو جائیں۔ عمرانی و اخلاقی مضرتوں سے محفوظ رہنے کے لیے انھوں نے یہ سفارش بھی کی ہے کہ کسی ایجاد سے پہلے ماہرین کے ایک گروہ کو اس پر غور کر لینا چاہیے کہ آیا یہ ضروری ہے؟ اور یہ کہ اس کے تہذیبی اثرات و نتائج کیا ہیں۔ یعنی کیا اس سے فتنہ و مضرت کے نئے نئے دروازے تو نہیں کھل جائیں گے اور جب تک کسی ایجاد کی افادیت کے بارہ میں پورا پورا الیقین نہ ہو جائے اور اس سے ابھرنے والے اثرات کا جائزہ نہ لیا جائے۔ اس وقت تک اس کو معرضِ وجود میں نہ آنے دیا جائے۔

ان سادہ لوح مستقبل آشنا حضرات کو کون سمجھائے کہ مسئلے کا یہ حل تسلی بخش نہیں۔ بھلا لذتِ ایجاد اور انسانی ذہن کی اپچ کب کوئی قدغن گوارا کرتی ہے۔ پھر نت نئی ایجادات اور بالخصوص ایٹمی ایجادات کے پس پردہ جو جذبہ کار فرما ہے وہ اپنے مزاج اور فطرت کے لحاظ سے صرف تہذیبی اور ثقافتی کہاں ہے؟ وہ تو سراسر

سیاسی اور استعماری مصلحتیں ہیں جو تباہ کن ایجادات کو وجود میں لا رہی ہیں۔ دُور کیوں جائیے یہ دیکھیے کہ کیا تخفیف اسلحہ کا ڈھونگ کئی سال سے نہیں چل رہا ہے۔ مگر اس کا کیا نتیجہ نکلا۔ کیا کوئی فریق اس پہ رضامند ہوا ہے کہ اس خوفناک ایٹمی اسلحہ کو تباہ کر دیا جائے جو خود ہماری تباہی کا سبب ہو سکتا ہے۔

ہمارے نزدیک سائنس اور ٹیکنالوجی کے موجودہ ارتقا نے جس سب سے بڑے خطرہ کو جنم دیا ہے وہ یہ ہے کہ انسانی تہذیب نے روحانی اور اخلاقی قدروں سے محرومی اختیار کر لی۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ علاوہ ان خطرات کے جن کی طرف مستقبل آشنا دانشوروں نے اشارہ کیا ہے، وہ قاہر اور با اختیار انسان جس نے اس مادی تہذیب کی تخلیق کی تھی، خود اس کے مقابلہ میں بے بس و مجبور ہو کر رہ گیا ہے۔ اس کا اختیار اس سے چھن گیا ہے۔ اور یہ قطعی اس لائق نہیں رہا کہ تہذیب کے اس اسپ تیز رفتار کو روک سکے۔ اس کی منہ زوریوں کا مداوا کر سکے۔ یا اس کے لیے راہ و منزل کا تعین کر سکے۔ مغرب کے دانا اس سلسلہ میں اس حقیقت کو فراموش کر دیتے ہیں کہ تہذیب انسانی کی جس بے راہ روی، غیر ضروری پھیلاؤ اور مضرتوں سے یہ پریشان ہیں اس کا حل **عقل** و تدبر کی فتنہ پردازیوں کے بجائے ایمان اور **عقیدہ** کی سلامتی و استواری میں پوشیدہ ہے

اگر آج کا مادہ پرست انسان آخرت پر ایمان لے آئے اور اس حقیقت کو تسلیم کر لے کہ دنیا کی عارضی فانی زندگی ہی سب کچھ نہیں ہے بلکہ اصل زندگی اور ہمیشہ کی زندگی وہ ہے جس کا تعلق ما بعد الموت کی کیفیات سے ہے، لہٰذا زندگی کے دنیوی نقشہ کو آئندہ زندگی کی بنیاد پر استوار ہونا چاہیے تو اس سے تہذیب کے بارہ میں زاویۂ نظر یکسر بدل جاتا ہے۔ اس صورت میں تہذیب انسانی کے غیر ضروری اور مہلک پھیلاؤ کا مسئلہ محض سائنسی تدبیر یا سمجھوتے اور مفاہمت کا مسئلہ نہیں رہتا۔ بلکہ عقیدہ اور ایمان کا مسئلہ بن جاتا ہے اور اخلاقی و روحانی قدروں کی پرورش و ارتقا کا مسئلہ ہو جاتا ہے۔ ان حالات میں انسان مجبور ہو جاتا ہے کہ شعوری سطح پر یہ فیصلہ کرے کہ اس کو تہذیب کی تیز رفتاریوں کی کس حد تک برداشت کرنا ہے اور کیونکہ اس کو معاشرہ کی فلاح و بہبود کے ساتھ ہم آہنگ رکھنا ہے۔ اس کے علاوہ یہ کہ قلبی ذہنی وابستگی کو کس حد تک قائم رکھنا ہے۔ ہمارے نزدیک جب تک تہذیب و تمدن کے تقاضوں کو کسی اخلاقی و روحانی پیمانہ کے تابع نہیں رکھا جائے گا۔ دوسری خرابیوں کے ساتھ ساتھ یہ خطرہ برابر بڑھتا جائے گا کہ یہ تہذیب کہیں اپنے ہی ہاتھوں خودکشی نہ کر لے۔

ومثل کلمۃٍ خبیثۃٍ کشجرۃٍ خبیثۃٍ اجتثت من فوق الارض ما لھا من قرار ۝ (ابراہیم : ۲۶)

اور بُری بات کی مثال اس گندے پیڑ کی طرح ہے جس کی جڑیں زمین ہی پرسے کاٹ دی گئی ہوں یا اس کے لیے قیام و قرار کہاں؟

محاسبہ سے ہماری مراد یہ ہے کہ معاشرہ کا ہر فرد ادراک کی اس نعمت سے بہرہ مند ہو کہ اسے اپنے اعمال کا جائزہ لینا ہے، زندگی کے تضادات کو دُور کرنا ہے، معروفات کی طرف قدم بڑھانا ہے اور برائیوں سے دامن کشاں رہنا ہے۔ اس لیے جب یہ طے پا گیا کہ زندگی کسی حادثہ کا نتیجہ نہیں بلکہ خالقِ حقیقی کی تدبیر و حکمت کا کرشمہ ہے۔ اور اس بات کو تسلیم کر لیا گیا کہ یہ ایک بامعنی حقیقت ہے۔ اس کی ایک منزل اور سمت ہے اور اس کے لیے ایک عقیدہ و نصب العین ہے نیز عقیدہ سے لے کر عمل کی جزئیات تک ہدایات، پیمانے، اور اصول ہیں، جن کو ملحوظ و مرعی رکھنے میں اس کی ارتقا و تکمیل کا راز مضمر ہے۔ تو اس صورت میں یہ لازم آتا ہے کہ ہر ہر مسلمان چوکس رہے اور قلب و ذہن کی جنبشوں کا محاسبہ کرتا رہے اور دیکھتا رہے کہ اس کی سعی اور کوشش میں انسانی تہذیب و ثقافت کو پروان چڑھانے سے جس پاکیزگی نیت، جس احساسِ ذمہ داری اور فرض شناسی کی حاجت ہے۔ کیا وہ اس میں موجود ہے، اور کیا اس کا ہر ہر قدم ٹھیک اسی سمت اور منزل کی طرف اٹھ رہا ہے جو اس کے لیے متعین کر دی گئی ہے۔ قرآن حکیم اس بارے میں دو ٹوک رائے کا اظہار کرتا ہے۔ اس کے نزدیک تہذیب و ثقافت، اخلاق و سیرت اور تزکیۂ روح کی دوڑ میں وہی شخص کامیابی و کامرانی سے ہمکنار ہوگا جس کے دل میں یقین کی کیفیت موجزن ہوگی کہ مجھے اللہ تعالیٰ کے ہاں حاضر ہونا ہے اور اپنے اعمال کی جوابدہی کرنا ہے:

اما من خاف مقام ربہ و نھی النفس عن الھوی ۝ فان الجنۃ ھی الماوی ۝ (نازعات : ۴۰)

اور وہ جو اپنے رب کے حضور کھڑا ہونے سے ڈرا اور نفس کو ادنیٰ خواہشات سے روکتا رہا۔ بیشک جنت ہی اس کا ٹھکانا ہے۔

اس کے برعکس جس نے سرکشی کی، جو اپنی منزل کو بھول کر راہ کی دلچسپیوں میں کھو گیا اور دنیا ہی کا ہو رہا۔ اسے معلوم ہونا چاہیے کہ اس نے جنت کو پانے، فلاح و بہبود کو اپنانے اور سفرِ آخرت میں سرخرو ہونے کے تمام مواقع سے محرومی اختیار کر لی:

فاما من طغیٰ و اٰثر الحیوٰۃ الدنیا   تو وہ جس نے سرکشی اختیار کی اور دنیا کو ترجیح دی
فان الجحیم ھی الماوٰی ۰ نازعات : ۳۹)   تو بے شک جہنم ہی اس کا ٹھکانا ہے ۔

یہ یاد رہے کہ محاسبہ کا یہ عمل پوری کائنات میں جاری و ساری ہے ۔ یہ قبۂ زنگار جسے ہم آسمان کہتے ہیں ۔ اور یہ معمورۂ ارض ۔ جو کھیتوں اور باغوں کی نکہت و بو کو اپنی آغوش میں لیے ہوئے نظر آرہا ہے بخطِ مستقیم اور آنِ واحد میں اس منزلِ ارتقا تک نہیں پہنچا ہے بلکہ اس سے پہلے یہ بتدریج اصلاح اور ارتقا کے ہزاروں مرحلوں سے گزرا ہے ۔ قرآن نے اصلاح و تدریج یا محاسبہ کے اس طویل عمل کو نہایت ہی بلیغ لفظ "سوی" سے تعبیر کیا ہے جس کے معنی از روئے لغت کسی شی کو درست اور ٹھیک کرنے کے ہیں ۔

ءانتم اشد خلقاً ام السماء بناھا ۰ رفع سمکھا فسوٰھا ۰ و اغطش لیلھا و اخرج ضحٰھا ۰ والارض بعد ذٰلک دحٰھا ۰ (نازعات : ۲۹)

کیا تمھاری سمجھ کے مطابق تمھیں ترکیب دینا زیادہ مشکل بات ہے ، یا آسمان کی تعمیر ۔ اللہ نے اسے بنایا ۔ اس کی چھت اونچی کی ۔ پھر اسے ٹھیک کیا اس کی راتوں کو تاریکی بخشی اور اس کی روشنی کو ہویدا کیا اور اس کے بعد اس کو پھیلایا ۔

اسی طرح کیا خود انسانی زندگی اور اشجار و حیوانات کی زندگی نے ہزاروں روپ نہیں بدلے ہیں اور اپنی حقیقی اور طے شدہ منزل تک رسائی حاصل کرنے سلسلے میں اصلاح و تدبیر کی ہزاروں تبدیلیوں کو گوارا نہیں کیا ؟

تہذیب و ثقافت کی سطح پر بھی اس قاعدہ کی حکمرانی ہے ۔ زندگی کے انہی اصولوں کو بالآخر بقائے دوام حاصل ہوا جو محاسبہ ، تحلیل اور تجربے کی کسوٹی پر پورے اترے اور وہ قومیں ، وہ دستور ، وہ آئین اور تہذیبیں صفحۂ ہستی سے حرفِ غلط کی طرح مٹادی گئیں ۔ جن میں منطقی طور پر صحت و استواری کا فقدان تھا ۔ جن میں انسانی دوستی اور "انفعیت" کی صلاحیتیں پائی نہیں جاتی تھیں ، یا جو محاسبہ اور تجزیہ سے عدل و انصاف کی ترازو پر اپنا وزن قائم نہ رکھ پائیں ۔ دین کی سیدھی سادی زبان میں یوں کہنا چاہیے کہ وہی لوگ جہنم کے سزاوار قرار پائے جو اس احساس سے عاری ہو گئے کہ انھیں اپنے اعمال کی جواب دہی کے لیے اپنے آقا و مولا کے حضور بالآخر پیش ہونا ہے :

انھم کانوا لا یرجون ۰ حسابًا و کذبوا بایاتنا کذابًا ۰ (انبیاء : ۲۸)

بلاشبہ انھیں دنیا کی زندگی میں حساب کا خوف نہ تھا ۔ مزید برآں انھوں نے ہماری آیتیں استطاعت بھر جھٹلائیں

اس کے علاوہ کہ محاسبہ کائنات اور ملّی زندگی کا ایک ہمہ گیر اور تخلیقی اصول ہے ۔ اسلام کے نقطہ نظر سے تہذیب و ثقافت کے معاملہ میں ۔ اس کی خصوصی اہمیت یہ ہے کہ تنہا یہی ایک عقیدہ ہے جو انسان میں پاکیزگیٔ عمل، اور سیرت و کردار کے لطائف کو قائم رکھ سکتا ہے ۔ یہ چند روزہ زندگی اپنے اندر اتنی رعنائیوں، دلچسپیوں اور فتنہ سامانیوں کو لیے ہوئے ہے کہ قدم قدم پہ ترغیبات کے حسین جال بچھے ہیں ۔ کہیں حبِّ جاہ کی کشش بڑے بڑوں کو راہِ راست سے ہٹانے کی کوشش کرتی ہے، کہیں مال و دولت کی محبت حرص و آز کے نتے نئے بُت تراشتی اور ان کے آگے غیور اور خوددار انسان کو جھکنے اور سجدہ کرنے پر مجبور کرتی ہے ۔ اور کہیں حسن و جنس کی غارت گری متاعِ ہوش و ایمان پر ڈاکہ ڈالتی اور رسوا کرتی ہے ۔ غرض ہمارے چاروں طرف شائستگی تہذیب اور کمال علم کے باوجود شیطان نے ہوس کی سُولیاں گاڑ رکھی ہیں ۔

لا قعدن لهم صراطك المستقيم ثم لآتينهم من بين ايديهم ومن خلفهم و عن ايمانهم وعن شمائلهم ولا تجد اكثرهم شاكرين ۔ (اعراف : ۱۷)

میں تیرے مقرر کردہ سیدھے راستہ پر ان لوگوں کی تاک میں بیٹھوں گا ۔ پھر ان پر میرے حملوں کا آغاز ہوگا ۔ میں ان کے آگے، پیچھے، داہنے، بائیں، ہر طرف سے آؤں گا اور ان لوگوں کو پھسلاؤں گا ۔ اور تو ان میں اکثر کو شکر گزار نہ پائے گا ۔

سوال یہ ہے کہ ان شیطانی ترغیبات کا مقابلہ کیونکر ممکن ہے ۔ انسان نے تجربہ سے دیکھ لیا ہے کہ صرف قانون کی بندشیں، تہذیب و تمدن کے تقاضے اور مادی اصول اخلاق کی روشنی میں تعلیم و تربیت کے مختلف اسلوب ایسے ہیں کہ ان کے بل پر انسان میں پاکیزگیٔ عمل، اور اخلاق و روحانیت کے ان لطائف کو پیدا نہیں کیا جا سکتا جو اعلیٰ تر تہذیب کی جان ہیں ۔ ان سے زیادہ سے زیادہ یہ ہو پاتا ہے کہ سطح کی حد تک انسان بعض تہذیبی تبدیلیوں کو اپنا لیتا ہے مگر روح و ضمیر میں نیکی اور پاکیزگی سے حقیقی وابستگی پیدا نہیں ہوتی ۔ ان ترغیبات کو جڑ سے اکھاڑنے اور انسان میں بلند تر اور پاکیزہ تر اسلوبِ حیات کو رواج دینے کا ایک ہی طریق ہے ۔ جو یہ ہے کہ ہر شخص کے دل میں محاسبہ اور حیاتِ اُخروی کے یقین پر در جذبے کے نقوش کو ابھار دیا جائے ۔ (باقی آئندہ)